

تفسیر القرآن

(۵)

اہتراء

(از رکوع ۳۴ تا حتم سورہ)

اللہ وہ زندہ خدا جو تمام کائنات کو سمجھالے ہوتے ہے، اُس کے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں، نہ اسے اُوکھ لگتی ہے نہ نیند آتی ہے، زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے، کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن کو

۱۔ یہ اور بات ہے کہ نوان لوگوں نے بے شمار دوسرے الٰہ مان رکھے ہوں مگر حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ الٰہی اکیلا اس کائنات کا سلطان مطلق ہے جس کے بل بوتے پر پورا نظام عالم چل رہا ہے، ہذا فی الواقع صرف الٰہ ہی اکیلا ہے، باقی سب سب فرعون الٰہوں کی اہمیت جھوٹی اور غیر واقعی ہے۔ اُس کے سوا کوئی دعا میں سننے اور حاجتیں پوری کرنے کا اقتدار نہیں رکھتا، کسی کے پاس قسمیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات نہیں، کسی دوسرے کو اس کی سلطنت میں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے آگے اعتراف بندگی میں سر جھکایا جائے، کسی کی حیثیت نہیں کہ اس کا حکم قانون ہو اور بے چون چڑھتا تسلیم کیا جائے، کوئی بیوقوف ناقص سے پاک نہیں کہ اسے مقدس و منترہ مانا جائے۔ یہ تمام خصوصیات جو اہمیت کے لوازم میں سے ہیں انہا الٰہی کے لیے مخصوص ہیں، کسی دوسرے کا ان میں کوئی حصہ نہیں۔

۲۔ یہ ان لوگوں کے خیالات کی تردید ہے جو خداوند عالم کی الٰہی کو اپنی ناقص ہمتیوں پر تکیا کر کے تم میں اور اس کی طرف وہ کمزوریاں منسوب کرتے ہیں جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

۳۔ اس فقرے میں اُن مشرکین کے باطل اوہام کا رکھیا گیا ہے جو اپنے اپنے گمانوں کے مطابق خدائی میں دوسری ہمتیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں، انہیں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ زمین و آسمان کا مالک اور ہر س چیز کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہے۔ اس کی ملکیت میں، اس کی تدبیر میں، اس کی پادشاہی و حکمرانی میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، بلکہ جس دوسری ہمتی کا بھی تصور کر سکتے ہو وہ بہر حال اس سلطنت کائنات کی ایک رعیت ہی ہوگی، پس جو خود ملک ہو وہ مالک کے ساتھ حقوق ملکیت میں شریک کیسے ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ اُن مشرکین کے خیالات کا ابطال ہے جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دوسری ہمتیوں کے (باقی صفحہ آئندہ پر)

اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اُس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت اور اک میں نہیں آسکتی الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے، اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے جن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں، وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔

(بقیہ صفحہ سابق) متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا ہزار و چلتا ہے جس بات پر اڑ بٹھیں وہ کرا کے چھوڑتے ہیں اور حکام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار، کوئی بڑے سے بڑا سینئر اور کوئی مقرب ترین فرشتہ اُس پادشاہِ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جرأت نہیں رکھتا۔

(حاشیہ صفحہ ۲۸۱) اس حقیقت کے اظہار سے شرک کی بنیادوں پر ایک در ضرب لگتی ہے۔ اوپر کے فقروں میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود حکمت اور اس کے مطلق اختیارات کا تصور پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ کوئی بالائستقلال شریک ہے اور نہ کوئی اس کے ہاں ایسا زور و آد ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اب ایک دوسری نیشیت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے کام میں دخل دے کیسے سکتا ہے جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظام کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں یا جن یا فرشتے یا دوسری مخلوقات سب کا علم ناقص اور محدود ہے۔ کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اٹل سفارش چل سکے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ نظام عالم تو ہر دکنار بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوند عالم ہی پوری طرح جانتا ہے اور ان کے لیے اس کے ہوا کوئی چارہ نہیں کہ خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں۔

۱۱۔ اہل میں لفظ کرسی استعمال ہوا ہے جسے بالعموم حکومت کے اقتدار کے لیے استعارہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔

۱۲۔ یہ آیت "تیرت لکری" کے نام سے مشہور ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی ایسی مکمل معرفت کی گئی ہے جس کی نظیر ہمیں نہیں ملتی۔

اسی بنا پر حدیث میں اس کو قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس محل پر خداوند عالم کی ذات و صفات کا یہ ذکر کس مناسبت سے آیا ہے، تو اسے سمجھنے کے لیے اُس تقویٰ کی ترتیب پیش نظر رہنی چاہیے جو سورعہ ۳۲ سے چل رہی ہے۔ پہلے مسلمانوں کو دینِ حق کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جدوجہد کرنے پر لگایا گیا ہے اور ان کمزوریوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے جن میں بنی

اہل تہلیل مبتلا ہو گئے تھے۔ پھر حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ فتح و کامیابی کا مدار تعداد اور ساز و سامان کی کثرت پر نہیں بلکہ ایمان، صبر و ضبط اور پختگیِ غم پر ہے۔ پھر جنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جو حکمت و تابت ہے اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ دنیا کا انتظام برقرار رکھنے کے لیے وہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ سے دفع کرتا رہتا ہے ورنہ ایک ہی گروہ کو اگر غلبہ و اقتدار کا دائمی پتہ

(باقی صفحہ آئندہ پیر)

دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ لی گئی ہے اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا اٹھایا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ (جس کا سہارا اُس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تیار کیوں سے روشنی میں نکال لاتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) مل جاتا تو دوسروں کے لیے جیسا دشوار ہو جاتا پھر اس شبہ کو دفع کیا گیا ہے جو ناواقف لوگوں کے دلوں میں اکثر ٹھکنے کے لیے لگاتار اپنے پیغمبر مختلف نجات کوٹھانے اور زراعت کا سد باب کرنے ہی کے لیے بھیجے تھے اور ان کی آمد کے باوجود یہ اختلافات مٹے، نہ نزاعات ختم ہوئے، تو کیا اللہ ایسا ہی بے بس تھا کہ اس نے ان خرابیوں کو دور کرنا چاہا اور نہ کر سکا؟ اس کے جواب میں بتایا گیا کہ اختلافات کو بجز روک دینا اور نوری انسانی کو ایک خاص راستہ پر زور چلانا اللہ کی مشیت ہی میں نہ تھا، در انسان کی کیا مجال تھی کہ اس کی مشیت کے خلاف چلتا۔ پھر ایک فقرے میں اس اصل مضمون کی طرف اشارہ کر دیا گیا جس سے تقریر کی ابتداء ہوئی تھی۔ اس کے بعد اب یہ اڑھا دیا ہے کہ انسانوں کے عقائد و نظریات اور سالک مذاہب خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، بہر حال حقیقت نفس الامری یہ ہے جس پر زمین و آسمان کا نظام قائم ہے۔ انسانوں کی غلط فہمیوں سے اس حقیقت میں ذرہ برابر کوئی فرق نہیں آتا۔ مگر اللہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ اس کے ماننے پر لوگوں کو برباد کر دیا جائے جو اسے مان لے گا وہ خود ہی فائدہ میں رہے گا اور جو اس سے منہ موڑے گا وہ آپ نقصان اٹھائے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) یہ یہاں "دین" سے مراد اللہ کے متعلق اس عقیدہ کو تسلیم کرنا ہے جو آیت الکرسی میں بیان کیا گیا ہے۔
 ۱۵ "طاغوت" لغت کے اعتبار سے ہر اس شخص کو کہا جائے گا جو اپنی جائز حد سے تجاوز کر گیا ہو قرآن کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی و خداوندی کا دم بھرے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کر لے۔ خدا کے مقابلہ میں ایک بندے کی سرکشی کے تین مرتبے ہیں۔ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ ہوا اس کی فرماں برداری کا معترف ہو مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے، اس کا نام فسق ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ اس کی فرماں برداری سے ہوا لاختر ہو کر خود مختار بن جائے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے لگے۔ یہ کفر ہے تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ وہ مالک سے باہمی ہو کر اس کے ملک و اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے۔ اس آخری مرتبہ پر جو بندہ پہنچ جائے اس کی نام طاغوت ہے۔ اللہ کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ طاغوت کا منکر نہ ہو۔

ہے، اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا؟ جھگڑا اس بات پر

۱۵ تاریکیوں سے مراد جہالت کی تاریکیاں ہیں جن میں بھٹک کر انسان اپنی فلاح و سعادت کی راہ سے دور نکل جاتا ہے اور حقیقت کے خلاف چل کر اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو فلفط راستوں میں صرف کرنے لگتا ہے۔ اور نور سے مراد علم حق ہے جس کی روشنی میں انسان اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنی زندگی کے مقصد کو صاف صاف دیکھ کر حلی و جہالصیرت ایک صحیح راہ عمل پر گامزن ہوتا ہے۔

۱۶ طاغوت کو بھینچنا: ہمتا لیا ہے، اس لیے کہ خدا سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طاغوت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ ایک طاغوت شیطان ہے جو اس کے سامنے ترغیبات کا سدباب اور ہنر باغ پیش کرتا ہے، دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے جو اسے جنابت و خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے سیدھے راستوں میں کھینچے کھینچے پھرتا ہے، اور تیسرا طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، بیوی اور بچے، اغوا اور قریب، برادری اور خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم پیشوا اور مہنا، حکومت اور حکام ایسے سب کے لیے طاغوت ہی طاغوت ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک اس سے اپنی ہواؤں کی بندگی کرتا ہے، اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضی سے بچے۔

۱۷ اوپر دعویٰ کیا گیا تھا کہ مومن کا حامی و مددگار اللہ ہوتا ہے اور وہ اسے تاریکیوں سے روشنی میں لاتا ہے اور کافر کے مددگار طاغوت ہوتے ہیں اور اسے روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اب سی کی توضیح کے لیے تین واقعات مثال کے طور پر پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پہلی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کے سامنے واضح دلائل کے ساتھ حقیقت پیش کی گئی اور وہ اس کے سامنے لاجواب بھی ہو گیا، مگر چونکہ اس نے طاغوت کے ہاتھ میں اپنی تکمیل دے رکھی تھی اس لیے وضوح حق کے بعد بھی وہ روشنی میں نہ آیا اور تاریکیوں ہی میں بھٹکتا رہ گیا۔ بعد کی دو مثالیں دو ایسے اشخاص کی ہیں جنہوں نے اللہ کا ہمارا بیکڑا تھا، سوال اللہ ان کو تاریکیوں سے اس طرح روشنی میں بحال لایا کہ پردہ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں تک کا ان کو عینی مشاہدہ کرا دیا۔

۱۸ اس شخص سے مراد نرود ہے جو حضرت ابراہیم کے وطن (مواق) کا بادشاہ تھا جب حضرت ابراہیم نے اپنے وطن میں توحید کا اعلان کیا اور ان تمام الہوں اور ایاب کی بندگی سے انکار کر دیا جن کی بندگی ان کے اہل وطن کر رہے تھے تو رفتہ رفتہ خاندان، برادری، اور قوم سے گذر کر حکومت وقت سے ان کے تصادم کی نوبت آئی اور انہیں ایک باہمی کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔

کہا براہیم کون ہے، اور اس بنا پر کہ اُس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی جب براہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ براہیم نے کہا، اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا اُسے مغرب سے نکال لے۔ یہ سن کر وہ منکر حق شد در رہ گیا، مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔

یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو جس کا گذر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری

۱۵ ان الفاظ سے بھگڑنے کی نوعیت پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ فرود کو خدا نے جو حکومت دے رکھی تھی اس کے نشہ میں مدہوش ہو کر وہ اس حقیقت کو بھول چکا تھا کہ ملک خدا کا ہے اور اس کی اصل حیثیت مالک کے نائب کی ہے جس کا کام مالک کے احکام کی تعمیل کرنا ہوتا ہے۔ نائب کے بجائے وہ خود مالک الملک و مقتدر اعلیٰ (یعنی رب) ہونے کا مدعی تھا۔ برعکس اس کے حضرت براہیم جس طرح دیوتاؤں کی باہنیت کے منکر تھے اسی طرح شاہی خاندان کی رویت کا بھی انکار کرتے تھے اور ان کی دعوت یہ تھی کہ تمام حیثیات سے تنہا اللہ ہی الہ اور رب ہے۔

یہاں یہ بات اور اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ فرود نہ تو اللہ کے وجود اور اس کے خالق زمین و آسمان اور مدبر کائنات ہونے کا منکر تھا اور نہ خود کائنات کا رب ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا جیسا کہ بعض مفسرین نے غلطی سے سمجھ لیا ہے، بلکہ اس کا دعویٰ صرف یہ تھا کہ میں اپنے ملک اور اس کے باشندوں کا رب یعنی حاکم مطلق ہوں، میری زبان قانون ہے اور میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں۔

۱۶ اگرچہ حضرت براہیم کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، تاہم فرود اس کا جواب ڈھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے مزید ڈھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اسی خدا کے زیر فرمان ہیں جس کو براہیم نے رب مانا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آ کر کیا کہتا۔ مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی اس کو تسلیم کر لینے کے معنی اپنی منطوق العنان فرماں روائی سے دست بردار ہو جانے کے تھے جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا لہذا وہ صرف ششدر ہی ہو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنا لیا ہوتا تو اس کے لیے حضرت براہیم کی اس تبلیغ کے بعد راہ راست کھل جاتی۔

۱۷ یہ ایک فضول بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدعا جس کے لیے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

پڑی تھی۔ اُس نے کہا یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا، بتاؤ کتنی مدت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ فرمایا، ”تم پر سو برس اسی حالت میں گذر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے، دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔“ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا ”میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے جب براہیم نے کہا تھا کہ ”میرے مالک مجھے دکھائے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔“ فرمایا کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا طمینا دکار ہے۔ فرمایا، اچھا تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے، پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے، پھر ان کو پکار، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے، خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار

(بقیہ صفحہ سابق) یہاں ذکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا ولی بنایا تھا اُسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام، دونوں کے تعین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ اس کا کوئی فائدہ۔ البتہ بعد کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جن صاحب کا یہ ذکر ہے وہ ذرور کوئی نبی ہوں گے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلسلہ اس سوال سے یہ دعوا نہیں کہ سائل حیات بعد الموت کے منکر تھے، یا انھیں اس میں شک تھا، بلکہ دراصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے۔

۱۵ ایک ایسے شخص کا زندہ پلٹ کر آنا جسے دنیا سو برس پہلے مردہ سمجھ چکی تھی، یہ بجائے خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جیتی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔

۱۶ یعنی وہ اطمینان جو مشاہدہ عینی سے حاصل ہوتا ہے۔

اور حکیم ہے۔

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک

۱۷ اس واقعہ اور اوپر کے واقعہ کی بعض لوگوں نے عجیب عجیب تاویلیں کی ہیں۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ کا جو معاملہ ہے اسے اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے تو کسی کھینچ تان کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ عام اہل ایمان کو اس زندگی میں جو خدمت انجام دینی ہے اس کے لیے تو محض ایمان بالغیب (بے دیکھے ماننا) کافی ہے۔ لیکن انبیاء کو جو خدمت اللہ نے سپرد کی تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے وہ حقیقتیں دیکھ لیتے جن پر ایمان لانے کی دعوت انھیں دینا کو دینی تھی۔ ان کے دینے سے پورے زور کے ساتھ یہ کہنا تھا کہ تم قیاسات دوڑاتے ہو مگر ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں، تمہارے پاس گمان ہے اور ہمارے پاس علم ہے، تم اندھے ہو ورنہ مینا ہیں۔ اسی لیے انبیاء کے سامنے فرشتے عیانا آئے ہیں، ان کو آسمان وزمین کے نظام حکومت (ملکوت) کا مشاہدہ کرایا گیا ہے، ان کو دوزخ اور جنت آنکھوں سے دکھائی گئی ہے، اور بعث بعد الموت کا ان کے سامنے مظاہرہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ ایمان بالغیب کی منزل سے جو حضرات منصب نبوت پر مامور ہونے سے پہلے گذر چکے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کے بعد ان کو ایمان بالشہادۃ کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت انھی کے ساتھ مخصوص ہے۔

۱۸ اب پھر سلسلہ کلام اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہے جو رکوع ۳۲ میں چھیڑا گیا تھا۔ اس تقریر کی ابتدا میں اہل ایمان کو دعوت دی گئی تھی کہ جس مقصد عظیم پر تم ایمان لائے ہو اس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں برداشت کرو۔ مگر یہ بات کہ ایک گروہ اپنی ذاتی یا قومی اغراض کے لیے نہیں بلکہ محض ایک بلند اخلاقی مقصد کے لیے مال و دولت ٹٹائے، اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا معاشی نقطہ نظر بالکل تبدیل نہ ہو جائے۔ مادہ پرست لوگ جو پیسہ کمانے کے لیے جیتے ہوں اور پیسے پر جان دیتے ہوں اور نفع و نقصان کی میزان ہی پر جن کی نگاہ ہر وقت جمی رہتی ہو، وہ کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ مقاصد عالیہ کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہ بظاہر اخلاقی مقاصد کے لیے کچھ خرچ کرتے بھی ہیں تو پہلے اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادی منافع کا حساب لگا لیتے ہیں۔ اس ذہنیت کے ساتھ اس دین کی راہ میں انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ ذبیوی فائدے اور نقصان سے بے پروا ہو کر محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کر دے۔ ایسے مسلک کی پیروی کے لیے تو دوسری ہی قسم کے اخلاقیات درکار ہیں۔ اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلہ کی فراخی، دل کی کشادگی اور سب سے بڑھ کر کھانا خدا طلبی کی ضرورت ہے، اور اجتماعی زندگی کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ افراد کے اندر مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بجائے یہ اخلاقی اوصاف نشوونما پائیں۔ چنانچہ یہاں سے مسلسل تین رکوعوں تک اسی ذہنیت کی تخلیق (باقی اگلے صفحہ پر)

دانہ بویا جائے تو اُس سے سات بالین نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دکھ دیتے ہیں، اُن کا اجر اُن کے رب کے پاس ہی اور اُن کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول، اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اُس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو، اللہ بے نیاز ہے اور ربوباری اس کی صفت ہے۔ اسے ایمان لانے والا

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔

۱۱ مال کا خرچ خواہ اپنے اعزہ و اقربا کی خبر گیری میں ہو یا محتاجوں کی اعانت میں، یا رفاہ عام کے کاموں میں، یا اخلاقیات دین اور جہاد کے مقاصد میں، بہر حال اگر وہ خالص خدا کی رضا کے لیے ہے تو اس کا شمار اللہ ہی کی راہ میں ہوگا۔

(حواشی صفحہ بڑا) یعنی جس قدر خلوص اور جتنے گہرے جذبہ کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اتنا ہی اللہ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہوگا جو خدا ایک دانہ میں اتنی برکت دیتا ہے کہ اس سے سات سو دانے اُگ سکتے ہیں اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمہاری خیرات کو بھی اسی طرح نشوونما بخشنے اور ایک روپے کے خرچ کو اتنی ترقی دے کہ اس کا اجر سات سو گونہ ہو کر تمہاری طرف سے پلٹے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اللہ کی دو صفات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ فراخ دست ہے، اس کا ہاتھ تنگ نہیں ہے کہ تمہارا عمل فی الواقع جتنی ترقی اور جتنے اجر کا مستحق ہو وہ نہ دے سکے۔ دوسرے یہ کہ وہ علیم ہے، بے خبر نہیں ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور جس جذبہ سے کرتے ہو، اس سے وہ ناواقف رہ جائے اور تمہارا اجر مارا جائے۔

۱۲ یعنی نہ تو ان کے لیے اس بات کا خوف ہے کہ ان کا اجر ضائع ہو جائے گا اور نہ کبھی یہ نوبت آئے گی کہ وہ اپنے اس خرچ پر پشیمان ہوں۔

۱۳ صدقہ کا لفظ صدق سے نکلا ہے جس کے اصل معنی سچائی کے ہیں، اور اس سے مراد وہ خیرات ہے جو خدا پرستی کے سچے جذبہ کے ساتھ کی جائے۔ اصطلاحاً صدقہ اور زکوٰۃ میں یہ فرق ہے کہ جو خیرات شرفاً لازم کی گئی ہے اس کا نام زکوٰۃ ہے، اور جو خیرات رضا کارانہ اپنی خوشی سے کی جائے اس کو صدقہ کہتے ہیں۔ لیکن قرآن بالعموم اس اصطلاحی فرق کو نظر انداز کر کے صدقہ اور زکوٰۃ دونوں کو ہم معنی الفاظ کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

۱۴ اس ایک فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تمہاری خیرات کا حاجت مند نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خود ربوبار ہے اس لیے اسے پسند بھی وہی لوگ ہیں جن کے اندر ربوباری کی صفت ہو۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اُس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے ز آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی، اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کہاتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا، اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پوسے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دو گنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی بھوار ہی اس کے لیے

(بقیہ صفحہ سابق) جو خدا تم پر زندگی کے اسباب و وسائل کا بے حساب فیضان کر رہا ہے اور تمہارے قصوروں کے باوجود تمہیں بار بار بخشا ہے وہ ایسے لوگوں کو کیوں کر پسند کر سکتا ہے جو کسی غریب کو ایک روٹی کھلا دیں تو احسان جتا کر اس کی عزت نفس کو خاک میں ملا دیں۔ اسی بنا پر حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز شرب ہمکلامی اور نظر عنایت سے محروم رکھے گا جو اپنے عطیہ پر احسان جتا ہو۔

(حواشی صفحہ ۲۸) اللہ اُس کی ریاکاری خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا اس کا محض لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا صریحاً معنی رکھتا ہے کہ خلق ہی اس کی خدا ہے جس سے وہ اجر چاہتا ہے، اللہ سے نہ اس کو اجر کی توقع ہے اور نہ اسے یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہو گا اور اجر عطا کیا جائے گا۔

۱۷ اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے، اور چٹان سے مراد اُس نیت اور اس جذبہ کی خرابی ہے جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے اور مٹی کی ہلکی تہہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال ابھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے۔ بارش کا فطری اقتضار تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور کھیتی نشوونما پائے لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اوپری اوپر ہو اور اس اوپری تہہ کے نیچے نرمی پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو تو بارش مفید ہونے کے بجائے اعلیٰ مضر ہوگی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشوونما دینے کی قوت رکھتی ہے مگر اس کے نافع ہونے کے لیے حقیقی نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو اوپر کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاع مال ہے اور کچھ نہیں۔

۱۸ یہاں کافر کا لفظ ناشکر سے اور نیک نیت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کی (راہی صفحہ ۲۸) آئندہ پر

کافی ہو جائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھر ابلخ ہو، نہروں سے سیراب کھجور اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اُس وقت ایک تیز گرم بگولے کی زد میں آکر ٹھلس جائے جبکہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے شاید کہ تم غور و فکر کرو۔

اے ایمان لانے والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ تم نے زمین تمہارے لیے نکالا ہے اُس میں سے بہتر حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم ہرگز اُسے لینا گوارا نہ کرو گے، اِلا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ تمہیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔

(بقیہ صفحہ سابق) اس کی راہ میں اس کی رضا کے لیے خرچ کرنے کے بجائے خلق کی خوشنودی کے لیے صرف کرتا ہے، یا اگر خدا کی راہ میں کچھ مال دیتا بھی ہے تو اس کے ساتھ اذیت بھی دیتا ہے، وہ دراصل ناشکلا اور اپنے خدا کا: سانس فراموش ہے۔ اور جب کہ وہ خود ہی خدا کی رضا کا طالب نہیں ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اسے خواہ نواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے۔

(حواشی صفحہ ۱۸) اللہ زود کی بارش سے مراد وہ خیرات ہے جو انتہائی جذبہ خیر اور کمال درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کی جائے۔ اور ہلکی پھوار سے مراد ایسی خیرات ہے جس کے اندر جذبہ خیر کی شدت نہ ہو۔

۱۸ یعنی اگر تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہاری عمر بھر کی کمائی ایک ایسے نازک موقع پر تباہ ہو جائے جبکہ تم اُس سے فائدہ اٹھانے کے سب سے زیادہ محتاج ہو اور از سر نو کمائی کرنے کا موقع بھی باقی نہ ہو تو کیا تم یہ پسند کرو گے کہ دنیا میں مدۃ العمر کام کرنے کے بعد جب آخرت کی زندگی میں تم قدم رکھو تو وہاں بیکایک تمہیں معلوم ہو کہ تمہارا پورا کارنامہ حیات یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا، جو کچھ تم نے دنیا کے لیے کمایا تھا وہ دنیا ہی میں رہ گیا، آخرت کے لیے کچھ کمایا ہی نہیں یہاں اس کے پھل کھا سکو تو وہاں تمہیں اس کا کوئی موقع نہ ملے گا کہ از سر نو اب آخرت کے لیے کمائی کرو۔ آخرت کے لیے کام کرنے کا جو کچھ بھی موقع ہے اسی دنیا میں ہے۔ یہاں اگر تم آخرت کی فکر کے بغیر ساری عمر دنیا ہی کی دھن میں لگے رہے اور اپنی تمام قوتیں اور کوششیں ذیوی فائدے سے تلاش کرنے ہی میں کھپاؤ، تو آفتابِ زندگی کے غروب ہونے پر تمہاری حالت بعینہ اُس بڑھکے کی طرح حسرت ناک ہوگی جس کی عمر بھر کی کمائی اور جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ تھا اور وہ باغ عین عالم پیری میں اُس وقت جل گیا جبکہ وہ خود نئے سرے سے بارغ لگا سکتا ہو (باقی صفحہ آئندہ پد)

شیطان تمہیں مغلسی سے ڈراتا ہے اور نثر مناک طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے، اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی۔ ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو دانشمند ہیں۔

تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو تندر بھی مانی ہو اللہ کو اس کا علم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے، تمہاری بہت سی برائیاں اس طرز عمل سے محو ہو جاتی ہیں، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو بہر حال

(بقیہ صفحہ سابق) اور نہ اس کی اولاد ہی اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے۔

اللہ ظاہر ہے کہ جو خود اعلیٰ درجہ کی صفات سے متصف ہو وہ بڑے اوصاف رکھنے والوں کو پسند نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فیاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہمیشہ دھمکے دریا بہا رہا ہے، کس طرح ممکن ہے کہ وہ تنگ نظر، کم حوصلہ اور پست اخلاق لوگوں سے محبت کرے۔

(حواشی صفحہ ہذا) اللہ حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوت فیصلہ ہے یہاں اس ارشاد سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی وہ ہرگز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ جائے گا بلکہ اس راہ کشادہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے۔ شیطان کے تنگ نظر مریوں کی نگاہ میں بڑی ہیشیاری اور عقلمندی ہے کہ آدمی اپنی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھے اور ہر وقت مزید کمائی کی فکر ہی میں لگا رہے۔ لیکن جن لوگوں نے اللہ سے بصیرت کا نور پایا ہے ان کی نظر میں یہ مین بے وقوفی ہے، اور حکمت و دانائی ان کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے اس سے اپنی متوسط ضروریات پوری کرنے کے بعد دل کھول کر بھلائی کے کاموں میں خرچ کیے۔ پہلا شخص ممکن ہے کہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں دوسرے کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش حال ہو لیکن انسان کے لیے یہ دنیا کی زندگی پوری زندگی نہیں بلکہ اصل زندگی کا ایک نہایت چھوٹا سا جزو ہے۔ اس چھوٹے سے جزو کی خوش حالی کے لیے جو شخص بڑی اور بے پایاں زندگی کی بد حالی مول لیتا ہے وہ حقیقت میں سخت بے وقوف ہے۔ اور عقلمند دراصل وہ ہے جس نے اس مختصر زندگی کی بہت سے فائدہ اٹھا کر تھوڑے سے سرمایہ ہی سے اُس کی زندگی میں اپنی خوشحالی کا بندوبست کر لیا۔

اللہ خرچ خواہ ماہ خدا میں کیا ہو یا راہ شیطان میں، اور نذر خواہ اللہ کے لیے مانی ہو یا غیر اللہ کے لیے، دونوں صورتوں میں

تمہاری نیت اور تمہارے فعل سے اللہ خوب واقف ہے۔ تمہوں نے اُس کے لیے خرچ کیا ہو گا اور اس کی خاطر (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس کی خبر ہے۔

لوگوں کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، ہدایت تو اللہ ہی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے اور خیرات کی قسم سے جو خرچ تم کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو، تو جو کچھ تم بھلائی کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گمراہ گئے ہیں کہ اپنی ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے، ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوشحال ہیں، تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے بڑھ کر کچھ مانگیں۔ ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ

(بقیہ صفحہ سابق) نذر مانی ہوگی وہ اس کا اجر پائیں گے، اور جن ظالموں نے شیطانی راہوں میں خرچ کیا ہوگا اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے لیے نذیر مانی ہوں گی ان کو خدا کی سزا سے بچانے کے لیے کوئی مددگار نہ ملے گا۔

نذیر ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے برآئے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اوپر لازم کر لے جو اس کے ذمہ فرض نہ ہو۔ اگر میرا کسی حلال وجہ نام کی ہو اور اللہ سے مانگی گئی ہو اور اس کے برآئے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے وہ اللہ ہی کے لیے ہو تو ایسی نذر اللہ کی طاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اور اگر یہ صورت نہ ہو تو ایسی نذر کا ماننا نصیحت اور اس کا پورا کرنا موجب عذاب ہے۔

نذر جو صدقہ فرض ہو اس کو علانیہ دینا افضل ہے اور جو صدقہ فرض کے ماسوا ہو اس کا اخفا زیادہ بہتر ہے۔ یہی اصول تمام اعمال کے لیے ہے کہ انفس کا علانیہ انجام دینا فضیلت کھتا ہے اور نوافل کو چھپا کر کرنا اولیٰ ہے۔

نذر یعنی چھپا کر نیکیاں کرنے سے آدمی کے نفس و اخلاق کی مسلسل اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے اوصاف حمیدہ خوب نشوونما پاتے ہیں، اس کی بُری صفات رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں، اور یہی چیز اللہ کے ہاں اس کو اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوٹے بہت گناہ اس کے نامہ اعمال میں ہوتے بھی ہیں انہیں اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۔ ابتداء میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور عام غیر مسلم اہل حاجت کی مدد کرنے میں تامل کرتے تو حواشی صفحہ آئندہ پر

نہ رہے گا۔

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور سنج کا مقام نہیں۔ مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو، اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں تجارت

(بقیہ صفحہ سابق) اور ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجت مندوں ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں ان کی یہ غلط فہمی دور کی گئی ہے۔ ارشادِ الہی کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہدایت اتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، تم حق بات پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے، اب یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ ان کو بصیرت کا نور عطا کرے یا نہ کرے۔ بہا و نیوی ٹال و متاع سے ان کی حاجتیں پوری کرنا، تو اس میں تم محض اس وجہ سے تامل نہ کرو کہ انھوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ اللہ کی خواہش کے لیے جس حاجت مند انسان کی بھی مدد کرو گے اس کا اجر اللہ تمہیں دے گا۔

۱۵ اس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کی خدمت میں اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیتے ہیں اور سارا وقت دینی خدمات میں صرف کر دینے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی معاش پیدا کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کر سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس قسم کے رضا کاروں کا ایک مستقل گروہ تھا جو تاریخ میں اصحابِ صفہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین چار سو آدمی تھے جو اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آگئے تھے، ہمہ وقت حضور کے ساتھ رہتے تھے، ہر خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے، حضور جس بہم پر چاہتے انھیں بھیج دیتے تھے، اور جب مدینہ سے باہر کوئی کام نہ ہوتا اس وقت یہ مدینہ ہی میں رہ کر دین کا علم حاصل کرتے اور دوسرے بندگانِ خدا کو اس کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ پورا وقت دینے والے تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ علم مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین معنی ہے۔

(حواشی صفحہ ۲۸) اصل میں لفظ ربوا استعمال ہوا ہے جس کے معنی عربی لغت میں زیادتی اور اضافہ کے ہیں۔ اصطلاحاً اہل عرب اس لفظ کو اس نئے رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرض دار سے ہمت کے معاوضہ میں وصول کرتا ہے۔ اسی کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت سودی معاملات کی جو شکلیں رائج تھیں اور جنہیں اہل عرب ربوا کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے وہ یہ تھیں کہ مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور دائی قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا، اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت دانہ ہوتی تو پھر وہ مزید ہمت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ یا مثلاً ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل سے زائد لوگرنی ہوگی۔ یا مثلاً قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اس مدت میں اصل رقم صح

(باقی صفحہ آئندہ پر)

بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہذا جس شخص کو

(یقیناً صفحہ سابق) اضافہ کے ادا نہ ہوتی تو فرید بہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔ اسی نوعیت کے معاملات کا حکم یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اہل عرب دیوانے اور پاگل آدمی کو محنون (یعنی آسیب زدہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے تو یوں کہتے کہ اسے جن لگ گیا ہے۔ اسی محاورہ کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سود خوار کو اس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخلوط الحواس ہو گیا ہو۔ یعنی جس طرح وہ شخص عقل سے خارج ہو کر غیر معتدل حرکات کرنے لگتا ہے اسی طرح سود خوار بھی روپے کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کے جنون میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ اس کی سود خوری سے کس کس طرح انسانی محبت، اخوت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں، اجتماعی فلاح و بہبود پر کس قدر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے، اور کتنے لوگوں کی بد حالی سے وہ اپنی خوشحالی کا سامان کر رہا ہے۔ یہ اس کی دیوانگی کا حال اس دنیا میں ہے، اور چونکہ آخرت میں انسان اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جس حالت پر اس نے دنیا میں جان دی ہے، اس لیے سود خوار آدمی قیامت کے روز ایک باولے، مخلوط الحواس انسان کی صورت میں اٹھے گا۔

(حاشی صفحہ ۲۸) لہٰذا یعنی ان کے نظریہ کی خرابی یہ ہے کہ تجارت میں اصل لاگت پر جو منافع لیا جاتا ہے اس کی نوعیت اور سود کی نوعیت کا فرق وہ نہیں سمجھتے اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں استدلال کرتے ہیں کہ جیسا کہ تجارت کا منافع جائز ہے تو سود کیوں ناجائز ہے۔ لہٰذا تجارت اور سود کا اصولی فرق، جس کی بنا پر دونوں کی معاشی اور اخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی، یہ ہے:

(۱) تجارت میں بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ تبادلہ ہوتا ہے، کیونکہ مشتری اُس چیز سے نفع اٹھاتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے، اور بائع اپنی اُس محنت، ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز پیدا کرنے میں صرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا، سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں سود دینے والے کو صرف ہمت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے تب تو ظاہر ہے کہ ہمت اس کے قطعی نفع نہیں ہے۔ اور اگر وہ تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے تب بھی ہمت میں جس طرح اُس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہر حال وہ کچھ لیتا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

اُس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود و خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ

(یقیناً حاشیہ صفحہ ساتی) ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ میون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو، بہر طور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر ان اس فائدہ کے بدلے میں جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ میون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائل معیشت، حتیٰ کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک، مضمم کر لے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایہ میں اصل شے جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، صرف نہیں ہوتی بلکہ برقرار رہتی ہے اور بچشمہ کرایہ دار کو واپس دیدی جاتی ہے۔ لیکن سود کے معاملہ میں قرض دار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اُس کو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافہ کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اُس کی حیثیت اصطلاحی شریک کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے طے شدہ منافع کا حقدار ہوتا ہے۔

ان وجوہ سے تجارت کی معاشی حیثیت اور سود کی معاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس کے برعکس سود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت یہ سود کی میں ظہور ہے کہ وہ افراد میں بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور پستی کی صفات پیدا کرتا ہے اور ہمدردی و داد و باہمی کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر سود معاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوع انسانی کے لیے تباہ کن ہے۔

حواشی صفحہ ۲۸۱ پر یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ اس نے کہا ایسا اسے اللہ معاف کر دے گا بلکہ ارشاد یہ ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کھا چکا سو کھا چکا کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کھا چکا اسے معاف کر دیا گیا بلکہ اس سے محض قانونی رعایت مراد ہے۔ یعنی جو سود پہلے کھایا جا چکا ہے اسے واپس دینے کا قانوناً (باقی اگلے صفحہ پر)

کرے وہ جہتی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سو دکا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔
اللہ کسی ناشکرے بد عمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔ ہاں جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور

(بقیہ صفحہ سابق) مطالبہ نہیں کیا جائیگا، کیونکہ اگر اس کا مطالبہ کیا جائے تو مقدمات کا ایک لائن تناسبی سلسلہ شروع ہو جائے جو کہیں جا کر ختم نہ ہو مگر اخلاقی حیثیت سے اس مال کی نجاست بدستور باقی رہے گی جو کسی شخص نے سو دی کا روبرو سے میٹھا ہو اگر وہ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والا ہوگا اور اس کا معاشی و اخلاقی نقطہ نظر واقعی اسلام قبول کرنے سے تبدیل ہو چکا ہوگا تو وہ خود اپنی اس دولت کو جو حرام ذرائع سے آئی تھی اپنی ذات پر خرچ کرنے سے پرہیز کرے گا اور کوشش کرے گا کہ جہاں تک ان حقداروں کا ہتہ چلایا جاسکتا ہے جن کا مال اس کے پاس ہے، اس حد تک ان کا حق انہیں واپس کر دیا جائے، اور جس حصہ مال کے مستحقین کی تحقیق نہ ہو سکے اسے اجتماعی فلاح و بہبود پر صرف کیا جائے۔ یہی عمل اسے خدا کی نرا سے بچا سکے گا۔ رہا وہ شخص جو پہلے کھائے ہوئے مال سے بدستور لطف اٹھاتا رہا ہے، تو بعد نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوردی کی نرا پاک کرے۔

(حواشی صفحہ ۲۸) اے یعنی محدود نگاہ رکھنا، لوگ جو کچھ دیکھتے ہیں، حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے نزدیک سو دولت بڑھتی ہے اور صدقات سے گشتی ہے۔ لیکن حقیقت سو دولت کو گھٹاتا ہے اور صدقات سے دولت کو نشوونما حاصل ہوتا ہے۔ سو کا خاصہ یہ ہے کہ پوری سوسائٹی کی دولت سمٹ سمٹ کر ایک محدود اور محدود طبقہ میں اٹھی ہوتی چلی جائے اور سوسائٹی کا کثیر اور کثیر طبقہ کم سے کم وسائل زندگی سے بھی محروم ہوتا جائے۔ یہ چیز بالآخر پوری سوسائٹی کے لیے تباہی کی موجب بن جاتی ہے اور اس تباہی سے وہ طبقہ بھی نہیں بچ سکتے جن کے پاس سرمایہ کٹھا ہوتا ہے برعکس اس کے صدقات دولت کو عام باشندوں میں پھیلاتے ہیں، اور اس سے اجتماعی دولت بڑھتی ہے۔ اگر فی الواقع محض خدا کی خوشنودی کے لیے، یا اور نام و نوا اور خود غرضی سے پاک ہو کر اجتماعی فلاح و بہبود اور انفرادی اعانت ہمدردی کے کاموں میں مال خرچ کرنے کی عادت لوگوں کے اندر پیدا ہو جائے تو یہ چیز عام خوشحالی کی موجب بن جاتی ہے۔ پھر چونکہ آخرت کی زندگی اسی دنیوی زندگی کے اعمال کا اخلاقی نتیجہ ہے اس لیے سو دکا زوال اور صدقات کا نشوونما ہاں اور زیادہ نمایاں صورت میں ہوگا۔

۱۰ ظاہر ہے کہ سو پر پوری ہی شخص چلا سکتا ہے جس کو دولت کی تقسیم میں اس کی حقیقی ضرورت سے زیادہ حصہ ملا ہو۔ یہ ضرورت سے زیادہ حصہ جو ایک شخص کو ملتا ہے، قرآن کے نقطہ نظر سے دراصل یہ اللہ کا فضل ہے، اور اللہ کے فضل کا صحیح شکریہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے اپنے بندے پر فضل فرمایا ہے اسی طرح وہ بندہ بھی اس کے دوسرے بندوں پر فضل کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس خدا کے فضل کو اس غرض کے لیے استعمال کرتا ہے کہ جو بندے دولت کی تقسیم میں اپنی ضرورت سے کم حصہ پاتے ہیں ان کے قلیل حصہ میں سے بھی اپنی دولت کے زور پر ایک ایک جزیرہ اپنی طرف کھینچ لے، (باقی اگلے صفحہ پر)

منازق قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ان کا اجر بے شک ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔

اے ایمان لانے والو! خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اصل لینے کے تم حقدار ہو۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ تمہارا قرض دازنگ دست ہو تو ہاتھ کھلنے تک اُسے نہلت دو، اور جو صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اُس دن کی رسوائی و مصیبت بچو جبکہ تم اللہ کی طرف واپس ہو گے وہاں ہر شخص کو اس کی کمائی ہوتی ہے کیسی یا بیدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہوگا۔

(بقیہ صفحہ سابق) وہ حقیقت میں ناشکر بھی ہے اور ظالم، جفاکار، بد عمل بھی۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۔ اس رکوع میں اللہ تعالیٰ بار بار دو قسم کے کرداروں کو بالمقابل پیش کر رہا ہے۔ ایک کردار خود غرض، زہر پرست، شائیلاک قسم کے انسان کا ہے جو خدا اور خلق دونوں کے حقوق سے بے پروا ہو کر روپیہ گنتے اور گن گن کر سنبھالنے اور ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے اس کو بڑھانے اور اس کی بڑھوتری کا حساب لگانے میں بہمک ہو۔ دوسرا کردار ایک خدا پرست، فیاض اور بہر دانا انسان کا کردار ہے جو خدا اور خلق خدا دونوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہو، اپنی قوت بازو سے کما کر خود کھائے اور دوسرے بندگان خدا کو کھلائے اور دل کھول کر نیک کاموں میں خرچ کرے۔ پہلی قسم کا کردار خدا کو سخت ناپسند ہے، دنیا میں اس کردار پر کوئی صالح سوسائٹی نہیں بن سکتی اور آخرت میں، ایسے کردار کے لیے غم و اندوہ اور کلفت و مصیبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ بخلاف اس کے اللہ کو دوسری قسم کا کردار پسند ہے، اسی سے دنیا میں صالح سوسائٹی بنتی ہے اور وہی آخرت میں انسان کے لیے موجب فلاح ہے۔

۲۔ یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اس سلسلہ کلام میں داخل کر دی گئی۔ اس سے پہلے اگرچہ سود ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے نروال کے بعد اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری مجرم بن گیا، چنانچہ جو قبیلے سود کھاتے تھے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کے ذریعے سے آگاہ فرمایا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ اسی طرح (باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! جب کسی مقرریت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پر مصلحت کی قابلیت بخشی ہو اُسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور امارہ شخص کراہے جس پر حق آتا ہے یعنی قرض لینے والا اور اُسے اللہ اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا امارہ نہ کرا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ امارہ لکھائے۔ پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہئیں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔ گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے

(بقیہ صفحہ سابق) نجران کے میسائیوں سے جب معاہدہ صلح ہوا تو اس میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمہارے درمیان حالت جنگ قائم ہو جائے گی۔ آیت کے آخری الفاظ کی بنا پر ابن عباس، حسن بصری، ابن سیرین اور ربیع بن انس کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دارالاسلام میں سود دکھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر باز نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ دوسرے فقہاء کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے جب تک وہ سود خوری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے اُسے چھوڑا نہ جائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۔ اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ قرض کے معاملہ میں مدت کا تعین ہونا چاہیے۔

۲۔ عموماً دستوں اور غیزوں کے درمیان قرض کے معاملات میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں لینے کو میووب، اور بے اعتمادی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے، لیکن اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ قرض اور تجارتی قراردادوں کو تحریر میں لانا چاہیے اور اس پر شہادت ثبت کرالینی چاہیے تاکہ لوگوں کے درمیان معاملات صاف رہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں جو اللہ سے فریاد کرتے ہیں مگر ان کی فریاد سنی نہیں جاتی۔ ایک وہ شخص جس کی بیوی بدخلق ہو اور وہ اس کو طلاق نہ دے۔ دوسرا وہ شخص جو یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ اور تیسرا وہ شخص جو کسی کو اپنا مال قرض دے اور اس پر گواہ نہ بنائے۔

۳۔ ان الفاظ سے بعض فقہاء نے یہ سمجھا ہے کہ گواہ مسلمان ہی ہونے چاہئیں لیکن امام ابوحنیفہ غیر مسلم کی شہادت کو بھی جائز رکھتے ہیں۔ ۴۔ مطلب یہ ہے کہ ہر کس و ناکس گواہ ہونے کے لیے موزوں نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کو گواہ (باقی اگلے صفحہ پر)

تو انہیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوائینیے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمہارے لیے زیادہ مہنی برانصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اور تمہارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں، مگر تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو ستا یا نہ جانے ایسا کر گے تو نافرمانی کا ارتکاب کر گے۔ اللہ کے غضب سے بچو، وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے تو دین بالقبض پر معاملہ

کرو

اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے اُسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ اپنے رب سے ڈرے۔

(یعنی منظر سابق) کیا جائے جو اپنے اخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم لوگوں کے درمیان قابل اعتماد سمجھے جاتے ہوں (جو اشیاء منجھ ہذا) اسے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روزمرہ کی خرید و فروخت میں بھی معاملہ بیع کا تحریر میں آجانا بہتر ہے جیسا کہ آج کل کیش میو لکھنے کا طریقہ رائج ہے، تاہم ایسا کرنا لازم نہیں۔

تو اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی مطلب ہے کہ کوئی فریق کاتب یا گواہ کو اس بنا پر نہ ستائے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف صحیح شہادت دیتا ہے۔

تو یہ مطلب نہیں ہے کہ دین کا معاملہ صرف مغربی میں ہو سکتا ہے، بلکہ ایسی صورت چوکنہ زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ نیز معاملہ دین کے لیے بشرطاً نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو صرف اسی صورت میں دین کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب شخص دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہو تو قرض کا مطالبہ اپنی کوئی چیز دین لکھ کر روپیہ لے لے۔ لیکن قرآن مجید چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے، اور یہ بات بلنا اخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند (باقی اگلے صفحہ پر)

اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ، جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔ تم اپنے دل کی باتیں خواہ ظاہر کرو خواہ چھپاؤ اللہ بہر حال ان کا حساب تم سے لے لے گا، پھر اسے اختیار ہے جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

رسول اُس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے، اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے

(بقیہ صفحہ سابق) آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے، اس لیے قرآن نے قصداً اس دوسری صورت کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رہن بالقض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اسے اپنے دیے ہوئے مال کے معاوضہ میں شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہو البتہ دودھ دینے والے جانور کا دودھ استعمال کر سکتا ہے اور سواری کے جانور پر وہ سوار بھی ہو سکتا ہے مگر یہ دراصل اُس چارو کا معاوضہ ہے جو وہ اس جانور کو کھلاتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) سہ شہادت دینے سے گریز کرنا، یا شہادت میں صحیح واقعات کے اظہار سے پرہیز کرنا، دونوں پر شہادت چھپانے کا اطلاق ہوتا ہے۔

سہ یہ خاتمہ کلام ہے، اس لیے جس طرح سورۃ کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا اسی طرح سورۃ کو ختم کرتے ہوئے بھی اُن تمام اصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دین اسلام کی اساس قائم ہے۔

سہ یہ دین کی اولین بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مالک زمین و آسمان ہونا اُن تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں اللہ ہی کی ملک ہونا، دراصل یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بنا پر انسان کے لیے کوئی دوسرا طریقہ عمل اس کے سوا جائز اور صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے آگے سب اطاعت جھکانے۔

سہ اس فقرے میں دعائیں اور ارشاد ہوئیں۔ ایک یہ کہ ہر انسان فرداً فرداً اللہ کے سامنے ذمہ دار (باقی اگلے صفحہ پر)

رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے، ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی، مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔

اللہ کسی تنفس پر اس کی مقدرت بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو سبکی گائی ہے اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔

(یقیناً صفحہ سابق) جو جواب دہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ پادشاہ زمین و آسمان جس کے سامنے آدمی جواب دہ ہے، غیب و شہادت کا علم رکھتا ہے حتیٰ کہ لوگوں کے چھپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۵۵۔ اللہ کے اختیار مطلق کا بیان ہے۔ اس کو کسی قانون نے باندھ نہیں رکھا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبور ہو بلکہ وہ مالک مختار ہے، ہر آدمی نے اور عوام کرنے کے کئی اختیارات اس کو حاصل ہیں۔

(حواشی صفحہ ۱۲) ۱۔ اس آیت میں تفصیلات سے قطع نظر کہ اسلام کے عقائد اور اسلامی طرز عمل کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ اللہ کو، اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اتنا، اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے (یعنی کسی کو مانا جائے اور کسی کو نہ مانا جائے)، اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخر کار ہمیں اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے، یہ پانچ اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ اور مسلمان کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم پہنچے اُسے بسر و چشم قبول کرے، اس کی اطاعت کرے، اور اپنے حسن عمل پر غرور نہ کرے بلکہ اللہ سے عفو و درگزر کی درخواست کرتا ہے۔

۵۶۔ یعنی اللہ کے ہاں انسان کی ذمہ داری اس کی مقدرت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا برگزیدہ ہو گا کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ اس سے باز پرس کرے کہ تو نے فلاں کام کیوں نہ کیا، یا ایک چیز سے بچنا فی الحقیقت اُس کی قدرت سے باہر ہو اور لڑنا اس پر واخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اپنی مقدرت کا فیصلہ کرنے والا انسان خود نہیں ہے، اس کا فیصلہ اللہ ہی کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا تھا اور کس چیز کی نہ رکھتا تھا۔ ۵۷۔ یہاں اللہ کے قانون مجازات کا ایک دوسرا قاعدہ کلیہ ارشاد ہوا ہے۔ ہر آدمی انعام اسی خدمت پر پائے گا جو اس نے خود انجام دی ہو یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کی خدمات پر دوسرا انعام پائے۔ اور اسی طرح ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کے قصور میں دوسرا پکڑا جائے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک آدمی نے کسی نیک کام کی بنا رکھی ہو اور دنیا میں ہزاروں سال تک اس کام کے اثرات (باقی اگلے صفحہ پر)

(ایمان لانے والو تم یوں دعا کیا کرو) مالک! ہم سے بھول چوک میں جو تصور ہو جائیں ان پر گرفت نہ کر۔ آقا! ہم پر وہ بوجہ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر تو ہمارا مولیٰ ہے پس کافروں کی جماعت کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

(بقیہ سابق) چلتے رہیں اور یہ سب اس کے کارنامہ میں لکھے جائیں، اور ایک دوسرے شخص نے کسی بُرائی کی بنا رکھی ہو اور صدیوں تک دنیا میں اس کا اثر جاری رہے اور وہ اس ظالم اول کے حساب میں درج ہوتا رہے۔ لیکن یہ اچھا یا بُرا جو کچھ بھی پہل ہو گا اسی کی سعی اور اسی کے سبب نتیجہ ہو گا۔ بہ حال یہ ممکن نہیں ہے کہ جس بھلائی یا جس بُرائی میں آدمی کی نیت اور سعی و عمل کا کوئی حصہ نہ ہو اس کی جزا یا سزا سے مل جائے۔

(حواشی صفحہ ۲۰۱) یعنی ہمارے پیش روں کو تیری راہ میں جو آزمائشیں پیش آئیں جن زبردست ابتلاؤں میں سے وہ گندے جن مشکلات سے انھیں سابقہ پڑا، ان سے ہمیں بچا۔ اگرچہ اللہ کی سنت ہی رہی ہے کہ جس نے بھی حق و صداقت کی پیروی کا عزم کیا ہے اسے سخت آزمائشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، اور جب آزمائشیں پیش آئیں تو مومن کا کام یہی ہے کہ پورے استقلال سے ان کا مقابلہ کرے، لیکن بہ حال مومن کو اللہ سے دعا یہی کرنی چاہیے کہ وہ حق پرستی کی راہ کو آسان کر دے۔

علاوہ یہی مشکلات کا آسانا ہی بار ہم پر ڈال جسے ہم سہارے جائیں، آزمائشیں ہل تہی ہی بھیج کہ ان میں ہم پورے اتر جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری قوت برداشت بڑھ کر سختیاں ہم پر نازل ہوں اور ہمارے قدم راہ حق سے ڈگمگا جائیں۔

تیسرا اس دعا کی پوری روح کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں جبکہ مکہ میں کفر و اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ لہذا ان پر معاصرہ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، اور صرف مکہ ہی میں نہیں بلکہ سرزمین عرب میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندہ خدا نے دین حق کی پیروی اختیار کی اور اس کے لیے خدا کی زمین پر سانس لینا دشوار نہ کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو اور دعا مانگ کر وہ دعا مانگنے والے کو خود ہی جیسا کہ گناہ کا ڈھنگ بتائے تو لینے کا یقین آئے آپس میں مانگنا ہے۔ اس لیے یہ دعا اُن وقت مسلمانوں کی لیے غیر معمولی تسکین قلب کی موجود تھی۔ علاوہ بریں اس دعا میں ہمنا مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کر دی گئی کہ وہ اپنے جذبات کو کسی نامناسب رُخ پر نہ بھنے دیں بلکہ انھیں اس دعا کے سانچے میں ڈھال لیں۔ ایک فائدہ اُن روح فرسا مظالم کو دیکھنے جو شخص حق پرستی کے عزم میں ان لوگوں پر توڑے جا رہے تھے، اور دیکھنے جس میں دشمنوں کی خلاف کسی تلخی کا شائبہ نہ تھیں، ایک فائدہ ان جسمانی تکلیفوں اور مالی نقصان کو دیکھنے جن میں یہ لوگ مبتلا تھے، اور دوسری طرف اس دعا کو دیکھنے جس میں کسی دنیوی مفاد کی طلب کا ادنیٰ نشان تک نہیں ہے۔ ایک طرف ان حق پرستوں کی انتہائی خستہ حالی کو دیکھنے اور دوسری طرف ان بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھنے جن سے یہ دعا بہتر ہے۔ اس تقابل ہی سے صبح امدانہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت اہل ایمان کو کس طرز کی اخلاقی و روحانی تربیت دی جا رہی تھی۔